محمد سعید الرحمٰن علوی

مولانا غلام رسول مہر اور پاکستان اسکیم

مسلمان قوم کو اللہ تعالیٰ نے جن ذہنی صلاحیتوں سے بہرہ ور فرمایا تھا۔ اس کا عملی ثبوت مختلف شعبوں میں اس قوم کی کارکردگی سے ہو سکتا ہے، علم و ادب کا ایک شعبہ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ ہے، ان ہر دو کے بانی ہونے کا سہرا مسلمان قوم کے سر ہے۔ تاریخ کے حوالہ سے پیغمبر اسلام کے ایک کاتبِ وحی مشہور مدبر اور دانشور سیدنا معاویہ بن ابی سفیان کو یہ شرف حاصل ہے تو فلسفہ تاریخ کے حوالہ سے علامہ ابنِ خلدون کا یہ اعزاز ہے کہ انہوں نے اسے ایک باقاعدہ فن کا روپ بخشا تھا۔ ان حضرات کے علاوہ کتنے ہی اصحابِ علم اور اصحابِ قلم تھے اور ہیں، جنہوں نے اس میدان میں جھنڈے گاڑے۔ لیکن گستاخی معاف۔ ہمارا پاکستانیوں کا معاملہ کچھ اس قسم کا ہے کہ ہمیں بہت سے میدانوں میں شرمندگی اور ندامت کا ایک قسم کا احساس ہوتا ہے اور بہت سے پہلو ایسے ہیں، جن کے حوالہ سے ہمارے پاس کوئی مستند لٹریچر نہیں۔ جناب بانیٔ پاکستان اپنے مقام و احترام کے حوالہ سے اس قابل تھے کہ ان کی شخصیت، کردار اور خدمات پر تفصیلی لٹریچر سامنے ہوتا، لیکن چند اصحابِ علم و قلم نے اپنی ذاتی عقیدت و تعلق کے نقطۂ نظر سے اس موضوع پر قلم اٹھایا یا پھر سرکاری سطح پر ایک برطانوی مصنف مسٹر بولیتھو سے ایک کتاب لکھوائی گئی۔ ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح نے بوجوہ اس کتاب پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جناب مصنف برطانیہ کے اس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں، جو شاہی خاندان کی تعریف و توصیف کے لئے مشہور ہے گویا آپ انہیں ایک قصیدہ گو یا درباری شاعر کہہ سکتے ہیں، تحقیق کے معیار پر پورا اترنے والا مصنف و مؤلف نہیں۔ انڈیا گورنمنٹ نے مسٹر گاندھی پر زبردست فلم بنوائی، جو ساری دنیا میں مقبول ہوئی اور پسند کی گئی، لیکن ہمارے یہاں بانیٔ پاکستان پر اس ضمن میں شروع ہونے والا کام اب تک تشنۂ تکمیل ہے۔ کچھ عرصہ قبل کراچی میں خاص بانی پاکستان کی خدمات اجاگر کرنے کی غرض سے ایک ادارہ کا قیام معرضِ وجود میں آیا، ایک کہنہ مشق اہلِ قلم جو اس کی سربراہی کے خواہش مند تھے، ناکامی کی شکل میں اس کے پیچھے پڑ گئے اور اس ادارہ سے بانیٔ پاکستان کی تقاریر کا جو مجموعہ چھپا تھا، اس پر پے در پے اعتراضات کئے، سب سے بڑھ کر بانیٔ پاکستان کی اس تقریر کو ہدفِ اعتراض بنایا گیا، جو انہوں نے جون 1947ء میں اسمبلی میں کی جو گویا ان کی پالیسی تقریر تھی۔

دراصل ہمارے یہاں جس بیماری نے جنم لیا اور اب اس کی جڑیں مستحکم ہو چکی ہیں، وہ یہ ہے کہ ہم انسانوں کو انسان کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ عقیدت کی شکل میں فرشتہ کے انداز میں اور مخالفت و نفرت کی شکل میں شیطان کے انداز سے دیکھتے ہیں۔ یہی وہ رویہ ہے، جس کی وجہ سے توازن و اعتدال نام کو باقی نہیں رہتا اور لوگ افراط و تفریط کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس بیماری کا ذکر کیا اور بتلایا کہ اسی سے عقیدت میں غلو پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کی انتہا شرک جیسی بیماری پر ہوتی ہے۔ قوم نوح جو سب سے پہلے شرک کی بیماری کا شکار ہوئی، اس کا یہی المیہ تھا، اسی المیہ کی دوسری شکل آباؤ اجداد کی اندھی تقلید ہے اور قرآن نے بتلایا کہ قبولِ حق کی راہ میں جو بڑی رکاوٹیں ہیں، ان میں سے ایک یہ رکاوٹ ہے۔ تاریخ کے معاملہ میں ہمارے اس رویہ نے ہمیں جس موڑ پر پہنچا دیا ہے، اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان کے حوالہ سے ہمارے یہاں کوئی مستند کام نہیں ہوا، حالانکہ یہ تحریک ہماری ملی زندگی کا ایک اہم حصہ تھا۔ آج ہر شخص اس تحریک کے حوالہ سے نامور کارکن بن کر اپنا قد بڑھانے کی فکر کرتا اور مفادات حاصل کرتا ہے، لیکن یہ کوئی نہیں بتلاتا کہ یہ سب کیسے ہوا؟

ہماری صحافتی زندگی کے دو اہم کردار ہیں، ایک کا نام غلام رسول مہر ہے، دوسرے کا نام پیر علی محمد راشدی۔ اول الذکر مشرقی پنجاب کے مردم خیز خطہ جالندھر کے باسی تھے تو دوسرے سندھ کے معروف خاندان کے فرزند، مہر مرحوم غالب، اقبال اور ابو الکلام پر اتھارٹی تھے، قدرت نے انہیں ذہن رسا بخشا تھا۔ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال اور سر فضل حسین جیسے حضرات اس نوجوان کی ذہنی صلاحیتوں سے برابر فائدہ اٹھاتے رہتے تو مرحوم سر سکندر حیات ان پر بہت اعتماد کرتے۔ مہر ابتدا میں مولانا ابوالکلام کی جماعت "حزب اللہ" کے رکن رہے، انہیں مولانا سے بے پناہ تعلق تھا، جو تقسیم کے فلسفہ پر شدید اختلاف کے باوجود قائم رہا۔ مولانا ظفر علی خان کے "زمیندار" کا فاضل

ایڈیٹر فلک ہوا تو سارا عملہ الگ ہو گیا اور اس طرح "انقلاب" کی داغ بیل ڈالی گئی۔ بقول مہر ربع صدی سے زائد کے عرصہ میں جو کچھ انقلاب کے لئے لکھا گیا اس کو جمع کیا جائے تو پانصد صفحات کی 80 جلدیں بن سکتی ہیں۔ مہر کی ذہنی صلاحیتوں، اس کی سیاسی اپروچ اور منطقی طرز استدلال سے متاثر ہو کر قرار داد پاکستان کی منظوری سے ڈیڑھ دو سال قبل موجودہ گورنر سندھ کے بزرگ سر عبداللہ ہارون نے "تقسیم ملک" کے لئے ایک پروگرام وضع کیا اور پیر، علی محمد راشدی جیسے معروف اہل قلم کو ساتھ لے کر اس معاملہ کو اس طرح آگے بڑھایا کہ مرحوم مہر کا دماغ ہر موقعہ پر مسیحائی کا فرض سرانجام دیتا رہا۔ یہ ساری داستان راشدی مرحوم نے مہر کی وفات 71ء کے بعد پاکستان کے ایک کثیر الاشاعت اخبار میں کئی اقساط میں لکھی، تو بہت سے لوگ چونک اٹھے، ڈپلومائی اور افسانوی کہانیوں کے رسیا لوگ حیران رہ گئے کہ یہ سب کیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ ایسا ہی تھا، سر عبداللہ ہارون سے لے کر جی - ایم سید تک، بہت سے سندھی اکابر اس مسئلہ پر سرگرم عمل تھے۔ بانی پاکستان کے حاشیہ خیال میں ابھی یہ بات نہ تھی، اس مسئلہ کو آگے بڑھانے کی غرض سے 1938ء میں کراچی میں عظیم الشان مسلم لیگ کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں مشرق و مغرب کی دو عظیم مسلم ریاستوں کا ایسا نقشہ پیش کیا گیا، جن کے درمیان غیر مسلم حکومت ایک جزیرے کی مانند ہو گی۔ اس مقصد کے لئے مہر نے سات مہینے مستقر لاہور سے دور رہ کر اتنا کام کیا کہ اس کا تصور ممکن نہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے بے پناہ سفر کئے، اقلیتی صوبوں کے رہنماؤں سے لے کر اکثریتی صوبوں کے رہنماؤں سے ملے۔ سر عبداللہ ہارون کی سرپرستی تھی تو علی محمد راشدی سفر و حضر کے مولانا مہر کے ساتھی۔ جناح صاحب جیسے ذمہ دار شخص کو بہت سے معاملات میں جس شخص نے اپنے منطقی استدلال سے قائل کیا وہ مہر تھے۔ یہ تمام تفصیلات راشدی کے قلم سے سامنے آئیں، جبکہ مہر کے بچوں نے دستاویزی قرار داد اور منصوبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری کے سپرد کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں یہ ساری داستان مرتب ہو کر سامنے آئی۔ آج سے 22 برس قبل ایک کثیر الاشاعت اخبار میں جو چھپا وہ مزید دستاویزات کے ساتھ اب مرتب ہو کر سامنے آیا تو میں حیرت میں ڈوب گیا۔ ان تفصیلات کے اصل انکشاف کرنے والے راشدی ہیں، عربی، فارسی، اردو اور سندھی سمیت مختلف زبانوں کے ماہر اور بے پناہ علمی و تحقیقی کام کے خالق۔ ذاتی مشاہدات راشدی کو وافر مقدار میں میسر آئے اور انہوں نے کلیجہ نکال کر کاغذ پر رکھ دیا۔ تمام تفصیلات سپرد قلم کر دیں اور اس بات کا ماتم کیا کہ مسلم لیگ کے عظیم اجلاس میں جو طے ہوا اس کو 1946ء میں مسلم لیگ اسمبلی کے چند ممبروں نے الٹ کر رکھ دیا اور اس سارے منصوبہ کا اس طرح حلیہ بگاڑا کہ خدا کی پناہ۔ کہا تو یہ بات کہ ہم مشرق و مغرب میں دو عظیم مسلم مملکتوں کے مالک ہوتے اور کہا یہ کہ سازشی عناصر کی قہرمانیوں اور ریشہ دوانیوں کے سبب ہم ایک ایسے ملک کے مالک بنے، جس کے دو حصوں کے درمیان ہزار میل کا فاصلہ تھا اور جس پر تبادلہ آبادی کا بے پناہ بوجھ تھا۔

یہ سب کیوں ہوا، طے شدہ اصولوں کے برعکس، پنجاب و بنگال جیسے واضح اکثریتی صوبے کیوں تقسیم ہوئے، مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی امین ریاست حیدر آباد کس المیہ کا شکار ہوئی۔ جونا گڑھ جیسی ریاستیں جو الحاق پاکستان کا اعلان کر چکی تھیں، وہ کیوں پاکستان کا حصہ نہ بن سکیں اور کشمیر حلق میں اٹک کر کیوں رہ گیا، پھر وہ کون لوگ تھے جنہوں نے 1956ء تک آئین نہ بننے دیا اور جب آئین بنا تو دو سال بعد اس کو کس نے توڑا اور کیوں؟ پھر وہ کیا اسباب تھے، جن کی وجہ سے 1971ء میں پاکستان جو پہلے ہی بقول راشدی نامکمل تھا۔ مزید توڑ پھوڑ کا شکار ہو گیا اور اندرا گاندھی کو ہماری آئیڈیالوجی کا مذاق اڑانے کا موقعہ مل گیا؟ یہ بڑے تلخ حقائق ہیں، لیکن حقائق حقائق ہوتے ہیں۔ زندہ اور باوقار قومیں ان سے سبق سیکھتی اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کرتی ہیں اور مستقبل کو سنوارنے کی فکر کرتی ہیں۔ اس داستان کے کردار غلام رسول مہر اور علی محمد راشدی ہیں جن کی پاکستان کے لئے محبت و اخلاص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس داستان سے بعض اکابر کی غلطیوں کا انکشاف پریشانی کا باعث بن سکتا ہے، لیکن ملت کی سرفرازی اور مستقبل کی بہتری کا سامان اس میں ضرور موجود ہے۔ افراتفری، نفسانفسی اور افراط و تفریط کے دور میں تاریخی سچائیوں کے اظہار کے لئے زہر کا پیالہ پینے والے سقراط سے بڑھ کر احترام کے مستحق ہیں اور ایسے ہی لوگ ہیں، جن کی سیرت و کردار بیت المقدس کی خدمت سے یہودی عدالت کی پھانسی تک کے مرحلے طے کرنے والے جناب مسیح کے کردار کا سایہ ہے، ایسے باکردار لوگوں کی قدر معاشرہ کا فرض ہے۔